Fikr-o-Nasar (Islamabad) 17:3-4 (1979)

# عہدِ نبوی اور اس کے بعد کے دور میں مُسلمانوں کا نظامِ تعلیم

بختیار حسین صدیقی

حصول تعلیم انسان کا مذہبی فریضہ ہے کیونکہ تعلیم اس کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور چونکہ زندگی کی اساس روحانی اور ابدی ہے اس لئے ابدیت کے نقطۂ نگاہ سے انسان کی ضروریات کو پورا کر کے وہ اس کے لئے ایک نظام کردار مرتب کرتی ہے جسے ثقافت کہتے ہیں۔ وہ ثقافت کی تشکیل ہی نہیں کرتی بلکہ نئی نسل میں اسے منتقل کر کے اس کا تحفظ بھی کرتی ہے۔

کسی قوم کی ثقافت زندگی کے متعلق اس کے مخصوص عقیدے یا تصور پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تصور ہی اس کی ثقافت کی روح رواں ہوتا ہے۔ اسلامی ثقافت کی بنیاد جس تصور پر استوار ہے وہ ہے توحید کا تصور جو اخلاقی اور روحانی قوت کو زندگی کا اصل محرک قرار دیتا ہے۔ توحید کا تصور کوئی بیجان مجرد تصور نہیں بلکہ ایک "زندہ قوت" اور ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ جب انسان کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور اس کے دل میں اس طرح گھر کرے کہ اس کی فکر، احساس اور ارادہ سب اس تصور کی تفسیر بن جائیں تو وہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن جاتا ہے خیال یا تصور میں بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے تنظیم کا اصول فراہم کرتا ہے اور معاشرے میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کے لئے مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہ توحید کے تصور ہی کی قوت تھی جس کی بدولت رسول اکرمؐ کی قیادت میں مدینے میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوا جس میں مہاجر و انصار کی کوئی تمیز نہ تھی۔ غریب اور امیر کا کوئی فرق نہ تھا۔ زبان، رنگ، خون، وطن اور نسل کی کوئی تفریق نہ تھی

جس کی روح رواں صرف اور صرف اخوت، محبت اور رواداری یعنی آدمیت کے احترام کا جذبہ ہے خیالات میں تبدیلی ہمیشہ معاشرتی نظام میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

توحید کا تصور اسلام کی تمام تعلیمات کی اساس ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بنیادی تصور کا مکمل علم کس طرح حاصل کیا جائے کہ ہماری زندگی عملی طور پر اس تصور کی تفسیر بن جائے۔ علم چونکہ عمل کی لازمی شرط ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اسلام کے نظریۂ علم کی طرف رجوع کریں۔ قرآن نے حواس اور عقل کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن صرف ان کے بل بوتے پر توحید کا علم نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ توحید کے علم کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی جس کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ خدا صرف اپنے خاص بندوں کو وحی کے ذریعے توحید کا علم عطا کرتا ہے۔ ان خاص بندوں کو پیغمبر کہتے ہیں۔ صرف پیغمبروں ہی کو توحید کا صحیح اور مکمل علم ہوتا ہے۔ بقیہ انسانوں کا فرض ہے کہ وہ پیغمبر کی تعلیم پر بے چون وچرا ایمان لائیں اور پھر اس تعلیم کی روشنی میں عقل و فکر کے ذریعے توحید کا علم حاصل کرنے کی کوشش کریں، جتنا کچھ علم وہ اپنی بساط کے مطابق حاصل کر سکتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ علم جزئی علم ہوگا اور کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس میں درجات کا فرق بھی ہوگا کیونکہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ ایمان علم حق کی اولیں شرط ہے۔ جس شخص کو پیغمبر کی تعلیم پر پختہ یقین ہے وہ اس یقین کی قوت کی بدولت اپنی عقل کے مطابق توحید کا جزئی علم حاصل کر سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ ایمان پہلے عقلی استدلال اور استنباط بعد میں۔ یہ ہے عقل کے ذریعے توحید کا علم حاصل کرنے کی لازمی شرط۔ صرف "اہل یقین" کے لئے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے، "انفس" میں خدا کی نشانیاں ہیں اور "آفاق" میں بھی۔ انہی لوگوں کو قرآن نے توحید کا نقش اپنے دل پر ثبت کرنے کے لئے فطرت کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔

## اسلامی طریق تعلیم

توحید کی تلقین اور "کتاب و حکمت" کی تعلیم دینے کے لئے رسول اکرمؐ کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ معلم کی حیثیت سے آپ کو وہ اصول اور طریقے بھی بتلائے گئے جو تعلیم کو خوشگوار، مؤثر اور کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔

پہلی بات آپ کو یہ بتائی گئی کہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ جس قسم کے لوگوں کو تعلیم دینا مقصود ہو، اسی ماحول سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو معلم مقرر کیا جائے جو ان کی افتاد طبع، میلانات و رجحانات طور طریقوں اور خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ چنانچہ "امیوں میں انہیں میں کا ایک رسول بنا کر بھیجا (گیا) تاکہ وہ انہیں اس کی آیتیں سنائے۔ ان کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔"(۲) اور جب لوگوں نے خیر البشر سے پوچھا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو حکم ہوا کہ آپ فرما دیجئے کہ "اگر زمین پر فرشتے رہتے ہوتے کہ اس میں چلتے اور رہتے تو البتہ ہم ان پہ آسمانوں سے فرشتے رسول بنا کر بھیجتے۔"(۳)

دوسری بات آپ کو یہ بتائی گئی کہ زبردستی کسی کو تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ استاد کا فرض ہے کہ پہلے وہ علم کی صحیح طلب اور خواہش پیدا کرے اور پھر تعلیم دے۔ تعلیم کی بنیاد انسان کی اپنی خود متحرکی پر ہے۔ استاد اس خود متحرکی کو تقویت پہنچا سکتا ہے لیکن کسی شخص میں اگر یہ مطلقاً موجود ہی نہ ہو تو وہ اسے زبردستی اس میں پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ آپ ان کے ایمان لانے کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ظاہر میں آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھتے ہیں۔ کیا آپ بہروں کو سنا کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے ہیں، گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو۔ اور اسی طرح ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو صرف ظاہری طور پہ آپ کو (مع معجزات اور کمالات) دیکھ رہے ہیں۔ پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں، گو ان میں بصیرت نہ ہو۔(۴) جس شخص کے دل میں علم کی لگن اور طلب نہ ہو، جسمانی طور پہ تو وہ معلم کے سامنے بیٹھا ہو لیکن ذہنی طور پہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز کہیں اور ہو اسے تعلیم دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

تیسری بات آپ کو یہ بتائی گئی کہ تعلیم دراصل ابلاغ کا نام ہے اور ابلاغ کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ ہر قوم کا اپنا اسلوب بیان ہوتا ہے جو اس کی زبان کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔ ابلاغ کی جو آسانیاں اور سہولتیں مادری زبان میں ہوتی ہیں کوئی دوسری زبان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ زبان خیال کی ترجمان ہے۔ مادری زبان ترجمانی کا یہ حق بہ طریق احسن ادا کرتی ہے اس لئے سننے والے کو مخاطب کی بات سمجھنے

میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسلوب بیان اتنا واضح اور مانوس ہوتا ہے کہ بات دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے ہر قوم میں ایسا پیغمبر بھیجا گیا جو اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ ان کی زبان میں انہیں توحید کی تعلیم دے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ "ہم نے ہر قوم میں ایسا پیغمبر بھیجا جو ان کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ (حق کی بات) ان کی زبان میں ان کے سامنے بیان کرے(۵)۔"

پہلی بات کا تعلق معلم کے انتخاب سے ہے، دوسری کا متعلم کے انتخاب سے اور تیسری کا تعلیم دینے کے لئے زبان کے انتخاب سے۔ اس کے بعد طریق تعلیم اختیار کرنے کی باری آتی ہے توحید کی تعلیم کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ قرآن نے اس سوال کا مختصر لیکن جامع جواب دیا ہے۔ "بلا اپنے رب کی راہ پر حکمت اور عمدہ طریقے سے نصیحت کے ذریعے اور ان سے بحث کر بہترین طریقے سے(۶)۔" اس آیت میں تدریس کے تین بنیادی اصول بتائے گئے ہیں حکمت، نصیحت اور بحث۔ قرآن چونکہ سرچشمۂ حکمت ہے، اس لئے معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے حکیمانہ نکات پر گہری نظر رکھتا ہو تاکہ وہ اس کے احکام کی حکمت کو اچھی طرح لوگوں کے دلوں میں بیٹھا سکے اور ذہنی طور پر انہیں مطمئن کر سکے۔ قرآن نے تدریس کے اس اصول کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کا ارشاد ہے "جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی(۷)۔" حکمت کی اسی اہمیت کی بنا پر اموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا اور کلام کی شکل میں اسلامی نصاب میں داخل ہوا۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ فطری وجدان کی نشو و نما کے لئے تصوف نے بھی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں جگہ پائی۔ تدریس کا دوسرا بنیادی اصول عمدہ طریقے سے نصیحت کرنا ہے۔ جس طرح پہلا اصول تعلیمی عمل میں فلسفے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اسی طرح دوسرا اصول نفسیات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ کسی شخص کو جب اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر نصیحت کی جائے تو ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ وہ اس میں اپنی ذلت نہ محسوس کرے۔ ورنہ وہ انہیں دور کرنے کے لئے کبھی اقدام نہیں کرے گا۔ تعلیم کا مقصود متعلم کی خودی کو تقویت پہنچانا ہے جو نرمی، شفقت اور ہمدردی کے رویے کا متقاضی ہے۔ سختی اور درشتی کا انسان پر اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے وہ اس پر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی

پر اثر آتا ہے۔ اسی نفسیاتی ردعمل کے پیش نظر جب حضرت موسےٰ کو فرعون کی تنبیہ کر کے بھیجا گیا تو انہیں واضح طور پر ہدایت کی گئی کہ "اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ شاید وہ (برضا و رغبت) نصیحت قبول کر لے یا عذاب الٰہی سے ڈر جائے"[8] تدریس کا تیسرا بنیادی اصول بحث و جرح ہے۔ حکمت اور نصیحت سے کام نہ چلے تو پھر معلم کو چاہیئے کہ وہ بحث کی طرف رجوع کرے۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھے کہ طریق بحث استدلال اور کلام دونوں اعتبار سے بہترین اور معیاری ہو۔ بحث عقلی دلائل پر مبنی ہو اور دلائل اتنے قوی اور مستحکم ہوں کہ مخاطب کو انہیں قبول کرتے ہی بنے۔ بحث کی ابتدا چونکہ سوال سے ہوتی ہے اس لئے قرآن نے سوال کرنے کی بالخصوص تاکید کی ہے۔ "اگر تم کوئی بات نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو"[9] علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے۔ بحث کے کچھ اصول ہوتے ہیں مثلاً الفاظ کو واضح اور متعین مفہوم میں استعمال کیا جائے۔ خیالات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہوں اور دلائل تضاد سے پاک ہوں۔ اس ضرورت کے پیش نظر اموی اور عباسی دور میں یونانی منطق عربی زبان میں منتقل ہوئی اور اسلامی نصاب کا ایک حصہ بنی۔

اسلام نے صرف استخراجی طریقے کو تعلیم کا ذریعہ نہیں بنایا۔ تحلیل و تجزیئے کے استقرائی طریقے کو بھی اس نے اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی کہ استخراجی طریق فکر و استدلال کو۔ جہاں اس نے بحث و جرح پر زور دیا ہے (جس میں استخراجی طریق استعمال ہوتا ہے) وہاں مظاہر قدرت کے مشاہدے اور ان پر غور و فکر کی بھی بار بار تاکید کی ہے۔ قدرت کی بنائی ہوئی نباتات، جمادات، حیوانات، معدنیات وغیرہ کے تجزیے سے ان کی ساخت، وظائف اور خواص کا جو علم حاصل ہوتا ہے اس سے بھی توحید کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ بصارت جب بصیرت کے ساتھ اس طرح متحد ہو جائے تو انفس اور آفاق میں ہر جگہ اللہ کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ "اور ہم نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا۔ ہر ایک ایک وقت معین میں چلتا رہتا ہے اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے۔ رات کی تاریکی سے دن کو چھپا دیتا ہے۔ ان امور میں سوچنے والوں کے لئے اللہ کی نشانیاں موجود ہیں"[10]

اسلام کی رو سے تعلیم انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ لیکن انسان صرف روح نہیں ہے۔ وہ جسم کے قالب میں ایک روح ہے جس کا تعلق اس فانی دنیا سے ہے۔ جسم روح کے لئے ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آلہ استعمال کرنے والے کا کمال چونکہ آلے کے خود اپنے کمال پر بھی بڑی حد تک منحصر ہوتا ہے اس لئے روح کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ جسم کی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی تعلیم کا فرض ہے قرآن کا حکم ہے: "دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھولو"[۱۱] اور رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: تم میں سے افضل ترین وہ شخص نہیں ہے جو اس دنیا کو اُس دنیا یا اُس دنیا کو اس دنیا کی خاطر چھوڑ دیتا ہے، بلکہ وہ ہے جو دونوں کے لئے کام کرتا ہے"۔

سورۂ بقرہ میں علم کے ساتھ ساتھ جسمانی وجاہت اور قوت کو بھی عال کی برتری کی وجہ بتایا گیا ہے: اور ہم نے علم اور جسم کے سلسلے میں اسے زیادہ کشادگی دی[۱۲]"۔ پس تعلیم کا مقصد روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ روح کی ضروریات کو پورا کرنے کا قرآن نے مفصل اور جامع طریقہ بتایا ہے لیکن جسم کی ضروریات کو پورا کرنا اس نے انسان کی اپنی عقل و فکر پر چھوڑ دیا ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم، فنی تعلیم وغیرہ کا نظام معاشرتی ضروریات کے اعتبار سے اُسے خود مرتب کرنا ہے۔ البتہ فنی تعلیم کی اہمیت کا قرآن نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ "اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے (بہت سے) فائدے ہیں[۱۳]"۔ حضرت داؤد کے بیان میں لوہے میں نرمی اور لچک پیدا کرنے کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ اور ہم نے اس کے واسطے لوہے کو نرم کیا[۱۴]"۔

ہر نصاب تعلیم میں کتاب کو مرکزی حاصل ہوتی ہے اور لیکچر بنیادی طریق تدریس ہوتا ہے۔ رسول اکرمؐ کو "کتاب" کی تعلیم دینے کے لئے "معلم" بنا کر بھیجا گیا۔ جیسے جیسے آپ پر وحی نازل ہوتی تھی آپ اس کے احکام کی حکمت کو نصیحت اور بحث کے پیرائے میں تلقین کرتے رہتے تھے۔ کفار نے اعتراض کیا کہ پیغمبر پر قرآن مجید پورا کا پورا ایک ہی مرتبہ کیوں نہیں نازل کیا گیا"۔ قرآن نے اس کا جواب دیا: "یہ اس لئے کہ ہم اس کے ذریعے سے تیرے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے[۱۵]"۔ "دل کو مضبوط" کرنے سے مراد اسلام کی تعلیمات کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا ہے اور یہ مقصد "ٹھہر ٹھہر کر" وقفہ دے کر پڑھنے ہی سے

حاصل ہو سکتا ہے، نہ کہ بغیر توقف کے لگاتار پڑھنے سے۔ بغیر وقفے کے پڑھنے سے ذہن تھک جاتا ہے اور حافظے پر اس کا منفی اثر پڑتا ہے۔ وقفہ دے کر پڑھنے سے ذہن تازہ دم رہتا ہے۔ سمجھنے، یاد کرنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا ہے۔ "ہم نے قرآن کو اس لئے ٹکڑے ٹکڑے کرکے نازل کیا کہ تو آہستہ آہستہ اس کو لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور ہم نے اس کو بتدریج نازل کیا"[۱۶]۔ اس سے تدریس کا یہ اصول مرتب ہوا کہ اگر سبق چھوٹا ہو تو پورا سبق ایک مرتبہ ہی پڑھا دیا جائے ورنہ سبق کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر لیا جائے اور انہیں بتدریج پڑھایا جائے تاکہ توجہ دینے اور یاد کرنے میں آسانی رہے۔ مضمون کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے اگلا حصہ پڑھاتے وقت پچھلے حصے سے اس کا تعلق ضرور بتایا جائے۔

"تدریج" کے اصول کا اطلاق جس طرح کتاب کے مطالعے اور اس کے درس پر ہوتا ہے اسی طرح کردار کی اصلاح اور سیرت کی تعمیر پر ہوتا ہے جو اسلام کی رو سے تعلیم کا اصل مقصود ہے۔ عادت طبیعت ثانیہ ہوتی ہے۔ اسے ایک دم سے نہیں بدلا جا سکتا، البتہ رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔ کسی بُری عادت کو چھوڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ کیا جائے۔ عزم میں جب پختگی آجائے تو جزوی طور پر اس پر عمل شروع کر دیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ عزم کی قوت بڑھے گی اور مذموم عادت کی گرفت ڈھیلی پڑتی جائے گی۔ اس عمل کا بالآخر یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ عادت ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے گی یہ ہے کسی عادت کو چھوڑنے کا نفسیاتی قانون جس کے مطابق قرآن نے "تدریج" شراب نوشی چھوڑنے کی تلقین کی ہے۔ پہلے مرحلے میں صرف اس بات پر زور دیا گیا کہ شراب نوشی کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی لیکن اس کے نقصانات فائدوں سے زیادہ ہیں۔ "لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔ ان میں لوگوں کے لئے (کچھ) فائدے بھی ہیں۔ لیکن فائدے کے مقابلے میں گناہ کا پلہ بھاری ہے"[۱۷]۔ اس آیت میں شراب کو ایک دم ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ ذہنی طور پر لوگوں کو شراب نوشی چھوڑنے پر آمادہ کرنے کے لئے صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس میں گناہ زیادہ ہے اور فائدہ کم۔

جب شراب کے گناہ ہونے کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو حکم ہوا کہ "اے ایمان والو نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تمہیں اتنا ہوش آجائے کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو۔ اس کا تمہیں علم ہو"[۱۸]۔ اس جزوی پابندی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ عادت کی گرفت ڈھیلی پڑی اور ارادے کی قوت بڑھی تو شراب کو مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا۔ "اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں۔ سو ان سے الگ ہو جاؤ تاکہ تم فلاح پاؤ"[۱۹]۔

علم کی کوئی حد نہیں ہے۔ "ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے"[۲۰]۔ اس لئے کسی ایک عالم سے پڑھ کر تحصیل علم کا شوق پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی عالم ملے اس سے فیض اٹھایا جائے خواہ اس کی خاطر دور دراز کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ حضرت موسیٰ کو جب یہ معلوم ہوا کہ خضر علیہ السلام کو ان باتوں کا علم ہے جو انہیں معلوم نہیں تو وہ ان کی تلاش میں نکل پڑے۔ جس جذبے کے ساتھ وہ اس سفر پر نکلے تھے قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے: "اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ اس مقام پر پہنچ جاؤں جہاں وہ دریا آپس میں ملتے ہیں یا یونہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا"[۲۱]۔ رسول اکرمؐ نے بھی تحصیل علم کے لئے سفر کرنے پر زور دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "علم حاصل کرو خواہ چین ہی میں کیوں نہ ملے"۔ ہر عالم کے اوپر چونکہ ایک عالم ہے اس لئے تعلیم دراصل عمر بھر کا مشغلہ ہے[۲۲]۔ اس کے لئے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ "انسان کا فرض ہے کہ وہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرے"۔ یہ ہے تحصیل علم اور تدریس کا وہ طریقہ جس کے مطابق رسول اکرمؐ نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔ اب ہم عہد نبوی اور اس کے بعد کے دور کے نظام تعلیم کی طرف رجوع کریں گے۔

## عہد نبوی کا نظام تعلیم

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو لوگوں کو کفر کی "ظلمت" سے نکال کر ایمان کا نور عطا کرتی ہے۔ اس رعایت سے ہم ظہور اسلام سے قبل کے زمانے کو عربوں کی جاہلیت کا دور کہتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عہد جاہلیت کے عربوں کی اپنی کوئی ثقافت نہ تھی ان کے اپنے

کوئی علوم و فنون نہ تھے جو ان کے لئے سرمایہ فخر و ناز ہوں۔ شاعری اور سخن فہمی میں انہیں فطری ملکہ حاصل تھا۔ میدان جنگ میں بھی وہ رجز پڑھتے ہوئے قدم رکھتے تھے۔ عکاظ کے میلے میں شعر و سخن کے باقاعدہ مقابلے ہوئے تھے جس میں شعراء تیغ زباں کے جوہر دکھاتے تھے۔ معاشرے میں شعراء کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے شاعروں پہ ناز کرتا تھا۔ شاعری کے بعد خطابت کا درجہ تھا۔ فصاحت، بلاغت اور طلاقت زبان عربوں کی فطرت میں داخل تھی۔ وہ اپنے بچوں کو اس کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے۔ اپنے آپ کو "عرب" یعنی فصیح البیان اور دوسری اقوام کو "عجم" یعنی گونگا ژولیدہ بیاں کہتے تھے۔ عربوں کو اپنے نسب پر بھی بڑا فخر تھا اور وہ اس کے تحفظ کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر قبیلے کے اپنے نساب ہوتے تھے جنہیں مختلف قبائل کے نسب نامے حفظ ہوتے تھے۔ آج کل کے مفہوم میں تاریخ کا تصور عربوں کے ہاں موجود نہ تھا۔ لیکن "اخبار عرب" یعنی عرب کی قدیم تاریخی داستانوں کو حفظ کرنے کا ان میں عام رواج تھا جنہیں وہ بڑے بڑے مجمعوں میں سناتے تھے۔ نجوم اور قیافہ شناسی سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ طب میں بھی وہ خاصی مہارت رکھتے تھے۔ بیطار اونٹ اور گھوڑوں کی بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ (۲۳)

عہد نبوی میں ایام جاہلیت کے ان علوم و فنون کی دینی نقطۂ نظر سے چھان بین کی گئی۔ جو علوم اسلامی تعلیمات کے منافی نہ تھے انہیں بدستور قائم رکھا گیا۔ جو اس کے منافی تھے انہیں مطلقاً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جن کی اصلاح ممکن تھی ان کی اصلاح کی گئی۔ چنانچہ نجوم اور کہانت کی قطعی ممانعت کر دی گئی۔ شاعری کے مخرب اخلاق حصے مثلاً فخاری، ہجو نگاری، فحاشی اور عریانی کو ایک قلم خارج کر دیا گیا، لیکن اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کو بدستور قائم رکھا گیا۔ عہد جاہلیت کے مشہور حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت کے کلام کی خود رسول اکرمؐ نے تعریف کی۔ حضرت حسان بن ثابت کو اپنی حکیمانہ شاعری کی وجہ سے دربار نبوی کا شاعر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ (۲۴)

دور جاہلیت کے علوم کی تطہیر عہد نبوی کے نظام تعلیم کا خارجی پہلو تھا۔ اس کا داخلی پہلو "کتاب و حکمت" کی تلقین تھی جس کا مرکز مسجد نبوی تھی۔ اس مسجد سے ملحق ایک چبوترہ تھا جہاں نبی اکرمؐ رونق افروز ہوتے اور حکمت

نصیحت اور بحث کے پیرائے میں کتاب مبین کی تعلیم دیتے۔ قرآنی احکام بتانے کے ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بھی بتاتے جاتے۔ جس کی تعلیم مکمل ہو جاتی اسے تبلیغ کے لئے بھیج دیتے۔ ابتدائے اسلام میں قرأ معلم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہجرت سے قبل نبی اکرمؐ نے حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت ام کلثومؓ کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔[۲۵] مدینے ہجرت کرنے کے بعد وہاں ایک پورا نظام تعلیم قائم ہو گیا۔ مسجد نبوی سے ملحق اصحاب صفہ کی ایک مستقل درسگاہ تھی سعید بن العاص اور عبادہ ابن الصامت کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے انہیں صفہ میں اس کام پر مامور کیا کہ وہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے اور قرآن کی تعلیم دیں۔[۲۶] صفہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جو اس غرض کے لئے وقف تھا کہ باہر سے تعلیم کے لئے آنیوالوں اور مقامی بے گھر طلبار کے لئے دارالاقامتہ کا کام دے اور مدرسے کا بھی۔ اس درسگاہ میں قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں۔ فن تجوید سکھایا جاتا تھا۔ کتابت کی بالخصوص تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ وحی، صلح و جنگ کے معاہدوں اور دعوت اسلام کے خطوط لکھنے کے لئے کتابت کا جاننا ضروری تھا۔ اسی طرح یہودیوں سے خط و کتابت کے لئے حضرت زید بن ثابت نے عبرانی زبان سیکھی۔ وہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبان بھی جانتے تھے۔ خواندگی کو فروغ دینے کی مہم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں جب ساٹھ ستر مکے والے گرفتار کر کے مدینے لائے گئے تو نبی اکرمؐ نے ان لوگوں کی رہائی کے لئے جو مالدار نہیں تھے لیکن خواندہ تھے یہ فدیہ مقرر کیا کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔[۲۷]

مدینے میں صفہ واحد درسگاہ نہ تھی۔ خود نبی اکرمؐ کے زمانے میں یہاں کم از کم نو مسجدیں تھیں۔ ہر مسجد درسگاہ کا کام دیتی تھی۔ اساتذہ کو معاوضہ قبول کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رسول اکرمؐ نے دین کی تعلیم کے علاوہ نشانہ بازی، پیراکی، تقسیم ترکہ، ریاضی، مبادی طب، علم ہیئت اور علم انساب کے مطالعے پر بھی زور دیا۔[۲۸] نشانہ بازی اور پیراکی بچپن میں سکھائی جاتی تھی۔ ہفتے میں ایک دن آپ نے عورتوں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا تھا۔ وہ جو سوالات کرتیں آپ ان کا مفصل جواب دیتے۔ ان کے لئے اپنے چرخہ کاتنا سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا۔ حضرت عائشہ فقہ اور دیگر اسلامی علوم نیز ادب، شاعری

اور طب میں بڑا دخل رکھتی تھیں(۲۹)۔ بعد میں صحابہ نے ابتدائی تعلیم عام کرنے کے لئے ایک زبردست مہم چلائی جس میں شاعری، خطابت اور مبادیات ریاضی کو بطور انتخابی مضمون شامل کیا گیا۔

## خلافت راشدہ کا نظام تعلیم

نبی اکرمؐ نے دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خواندگی کی جو مہم شروع کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصے میں صحابۂ کرام نے معمولی نوشت و خواند کے بقدر تعلیم حاصل کر لی۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں (۶۳۲ء- ۶۶۱ء) ان علوم و فنون کا دائرہ وسیع ہوا جو عہد نبوی میں رائج تھے۔ اور تبلیغ کی ضرورتوں اور دوسری اقوام کے تیزی سے حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے انہیں حل کرنے کے لئے نئے علوم و فنون ایجاد ہوئے جن میں نحو، اصول فقہ اور حدیث کی صحت کو جانچنے کے علوم سرفہرست آتے ہیں۔ سیر و مغازی کی بنیاد پڑی۔ خطابت، علم انساب اور علم الفرائض کو فروغ ہوا۔

علم انساب عربوں کا پرانا علم تھا۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ اس کے مانے ہوئے عالم اور اپنے زمانے کے مشہور نساب تھے۔ حضرت عمر نے وظائف دینے کے سلسلے میں قبائل عرب کا نقشہ مرتب کرایا جس سے انساب کے علم کی تحریر و تدوین کا آغاز ہوا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ شعر و سخن کے بڑے ناقد تھے۔ حضرت علی کے نام سے تو ایک پورا دیوان منسوب ہے، گو یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن جوزی نے سیرت العمر میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے جو مکاتب قائم کئے تھے ان میں آگے چل کر ادب، لغت اور شعر وغیرہ کی تعلیم دی جانے لگی۔ خود حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ "تم اپنی اولاد کو اچھے اشعار یاد کراؤ"۔ تبلیغ، معاشرتی معاملات اور جنگ اور صلح کی شرائط طے کرنے کے سلسلے میں فن خطابت کو بالخصوص ترقی ہوئی۔ حضرت علیؓ کے مجموعۂ خطبات، نہج البلاغہ سے اس زمانے کی خطابت کے معیار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ علم الفرائض یعنی میت کے ترکے کی تقسیم کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ میراث کی تقسیم کے لئے حساب کا جاننا ضروری تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک رومی حساب دان سے اس علم کے اصولوں کو مرتب کرایا۔ حضرت زید بن ثابت اور عبداللہؓ ابن مسعود اس علم کے بڑے ماہر تھے۔ عربی عربوں کی زبان تھی۔ وہ بغیر اعراب اور قواعد کے اسے صحیح پڑھ

لیتے تھے۔ لیکن جب دوسری قومیں مسلمان ہوئیں تو وہ قرآن پڑھنے میں غلطی کرتی تھیں۔ اس لئے حضرت علیؓ کی ہدایت پر ابوالاسود دؤلی (م۔ ۶۸۸ء) نے نحو کے چند ابتدائی قاعدے وضع کئے جن سے بعد میں رفتہ رفتہ نحو کا جامع اور مبسوط علم وجود میں آیا۔ (۳۰)

فقہ کے فن نے خلفائے راشدین کے دور میں جنم لیا۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں جب کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوتا تھا تو اس کے حل کے لئے وحی نازل ہوتی تھی یا آپؐ خود اس کا حل بتا دیتے تھے۔ اس لئے اس زمانے میں فقہ کی ضرورت نہ تھی۔ آپکی وفات کے بعد قرآن اور حدیث کی بنیاد پر فقہ کا نیا علم وجود میں آیا۔ صحابہ کرامؓ انہیں سے نئے مسائل کا استنباط کرتے تھے۔ جب ان دونوں میں مسئلے کا حل نہ ملتا تھا تو عقل سے کام لیتے تھے جسے فقہی اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ حضرت عمر کو فقہ اور اجتہاد میں غیر معمولی درک تھا انہوں نے اصول فقہ کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں ترقی کرتے کرتے ایک مستقل اور مبسوط فن کی حیثیت حاصل کر لی۔

حضرت عمر نے دینی اور لسانی علوم کی تعلیم کے لئے ایک وسیع نظام قائم کیا۔ تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن کے درس کے لئے تنخواہ دار معلم مقرر کئے۔ ابو دردا کے حلقۂ درس میں طلبار کی تعداد سولہ سولہ سو تک پہنچ جاتی تھی جنہیں وہ دس دس کی جماعت میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود ان کی نگرانی کرتے تھے۔ زیادہ تر تشریعی احکام سورۂ بقر، سورۂ نسار سورۂ مائدہ، سورۂ حج اور سورۂ نور میں ہیں اس لئے ان کا سیکھنا لازمی قرار دیا بدوؤں کے لئے قرآن کی ابتدائی تعلیم لازمی بلکہ جبری کر دی۔ ابوسفیان کی قیادت میں ایک معائنہ ٹیم اس غرض سے مقرر کی کہ وہ مختلف قبائل میں جا کر ہر شخص کا امتحان لے اور جسے قرآن کی کوئی سورت بھی یاد نہ ہو اسے سزا دے۔ طلبار کے لئے وظائف مقرر کئے۔ قرآن مجید کی صحیح قرأت اور اعراب کی غلطیوں سے بچنے کے لئے عربی زبان اور ادب کی تعلیم لازمی کر دی اور یہ حکم جاری کیا کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے۔ (۳۱)

حدیث کی صحت کی تحقیق کے اصول مقرر کئے اور غلط روایات کی اشاعت کا سد باب کیا۔ اصول حدیث کی طرح اصول تفسیر کی بنیاد ڈالی۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور سب سے مستند دور جاہلیت کے عرب شعراء کا کلام ہے اس لئے مفسر قرآن صحابہ کو قرآن کے جن الفاظ کے معانی میں شبہ ہوتا تھا وہ اس کی تحقیق دور جاہلیت کے

عرب کلام سے کرتے تھے۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس کہا کرتے تھے کہ جب اللہ کے کلام میں کسی لفظ کے معنی سمجھ میں نہ آئیں تو اسے اشعار عرب میں تلاش کرو۔[۳۲] اس لئے شاعری کا ذوق اس دور میں بھی قائم رہا۔ الجاحظ (البیان، جلد دوم، ص ۹۲) نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم صادر کیا تھا کہ "اپنے بچوں کو تیراکی، گھوڑے کی سواری، مشہور کہاوتوں اور عمدہ اشعار کی تعلیم دو"۔

## اموی دور کا نظام تعلیم

بنی امیہ کے عہد (۶۶۱ - ۷۵۰ء) میں مدینہ، مکہ اور کوفہ علمی مرکز بنے ہوئے تھے۔ دین کی بنیاد قرآن اور حدیث ہیں اور یہ دونوں عربی میں ہیں۔ اس لئے صرف، نحو، لغت، معانی اور اسماء الرجال نصاب تعلیم میں شامل کئے گئے۔[۳۳] خلیفہ عبدالملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا جس سے عربی دانوں کی مانگ بڑھ گئی۔ دوسری اقوام کے لئے عربی سیکھنا لازمی ہو گیا۔ خطاطی کے اصول منضبط کئے گئے۔ خواندگی کا معیار بڑھ گیا۔ پیشہ ور استاد وجود میں آئے۔ صحیح اور فصیح عربی بولنے کا رجحان اس قدر بڑھا کہ اعلیٰ گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو صحرائی مدارس میں بھیجتے تھے جہاں بادیہ کے بدو انہیں زبان کی تعلیم دیتے تھے۔ خطاطی کے ساتھ ساتھ عربی انشاء میں ترقی ہوئی، وزراء، امراء، رؤسا سب ہی اپنے کاتب رکھتے تھے۔

قرأت اور تفسیر کی ابتداء نزول قرآن سے ہو گئی تھی۔ اموی دور میں ان فنون نے بڑی ترقی کی۔ بڑے بڑے ائمہ تفسیر اور قرآن کے سات مشہور قاری اس دور میں پیدا ہوئے۔ سب سے زیادہ ترقی حدیث کو ہوئی۔ بڑی حزم و احتیاط سے احادیث کا ذخیرہ جمع کیا گیا اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اس کے درس کے حلقے قائم کئے گئے۔ حدیث کی تدوین اور اشاعت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مختلف علماء سے حدیث کے مجموعے مرتب کرائے اور ان کی نقلیں تمام مفتوحہ ممالک میں بھیجیں۔ مغازی اور سیرت نے اس دور میں باقاعدہ تاریخ کی شکل اختیار کر لی۔ سب سے پہلے امام زہری نے اس فن پر کتاب لکھی۔ محمد بن اسحاق نے اسے ترقی دی۔ لایعنی قصوں، کہانیوں کو نظر انداز کر کے اسے حقائق کا مرقع بنایا۔[۳۴] فن لغت کی ابتداء قرآن کی

تفسیر کے سلسلے میں خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوئی۔ حضرت عمر نے حکم دیا تھا کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے۔ لیکن لغت کی علمی تدوین کا کام اموی دور میں شروع ہوا۔ حضرت علی کے شاگرد ابوالاسود دُوَلی نے نحو کے چند ابتدائی قواعد بنائے تھے۔ ابوالاسود کے تلامذہ یحییٰ بن عمیر، عنبسہ بن سعدان اور میمون بن اقران نے اس فن کو ترقی دی۔ عربی خط ابتداء میں معریٰ تھا۔ اس میں نقطے اور اعراب نہ تھے اس لئے دوسری قومیں پڑھنے میں غلطی کرتی تھیں۔ اس کے سدباب کے لئے حجاج بن یوسف ثقفی نے قرآن پر اعراب اور نقطے لگوائے۔(۳۵)

دینی اور لسانی علوم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ یونانی منطق، فلسفہ اور دیگر علوم کو عربی میں منتقل کرنے کا کام اسی دور میں شروع ہوا۔ یونانی علوم کے تراجم بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے جس کا اثر اس زمانے کے طریق تدریس اور نصاب تعلیم پر بھی پڑا۔ تعلیم حکومت کی ذمہ داری نہیں تھی۔ مسجدوں سے ملحق مدرسوں میں علماء کے اپنے اپنے حلقہ درس تھے۔ ان حلقہ اسکولوں میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ عربی زبان، قواعد، ادب، شاعری اور انشا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدینے میں ربیعہ رائی کا حلقہ درس مشہور تھا۔ تعلیم اور علماء دونوں حکومت کے اثر سے آزاد تھے۔

## عباسی دور کا نظام تعلیم

اموی دور میں جو علمی ترقی شروع ہوئی تھی وہ عباسی عہد (۷۵۰ - ۱۲۵۸ء) میں اپنے منطقی کمال پر پہنچ گئی۔ اس سے خواندگی کو فروغ ہوا۔ معیار تعلیم بڑھ گیا۔ ابتدائی تعلیم تقریباً عام ہو گئی۔ عباسی خلفاء علم اور خواندگی کے بڑے سرپرست تھے اور تعلیم کو اپنی قومی قوت کا ستون سمجھتے تھے۔ "ہارون رشید سے شروع ہو کر وہ سب اس بات پر زور دیتے تھے کہ پڑھنے لکھنے، حساب، تھوڑی بہت ابتدائی سائنس جغرافیہ تاریخ وغیرہ کا بنیادی علم حاصل کرنے کا ہر مسلمان بچے کو موقع ملنا چاہیئے۔ اس لئے انہوں نے ہر مسجد میں ایک پرائمری اسکول کھولنے کا اہتمام کیا اور خواندگی عام ہو گئی۔"(۳۶) ان کے اس جوش و خلوص پر تبصرہ کرتے ہوئے ای۔ ایچ ویلڈز لکھتا ہے: "مسلمانوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے اسکول کھولنے میں جس فیاضی

کا منظاہرہ کیا وہ ان کی تہذیب کے بڑی شان اور تیزی سے پھیلنے کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ تعلیم کو اتنا عام کر دیا گیا کہ یہ کہا جاتا تھا کہ ایسے کسی مسلمان کا ملنا مشکل ہے جسے پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو"(۳۷)۔

عباسی خلفاء کے زمانے میں جہاں ابتدائی تعلیم عام ہوئی وہاں اعلیٰ تعلیم کو بھی زبردست فروغ ہوا۔ خلیفہ المامون نے اعلیٰ تعلیم کا پہلا ادارہ ۸۳۰ء میں بغداد میں قائم کیا۔ اس کا نام بیت الحکمت تھا اس میں ایک دارالترجمہ، ایک کتب خانہ اور ایک لیبارٹری (معمل) بھی تھی جس میں سائنس کے تجربے کئے جاتے تھے۔ ابتداء میں اس کا کام یونانی منطق، فلسفے، طب، ریاضی، ہیئت، طبیعی اور حیاتیاتی علوم کو عربی منتقل کرنا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک تحقیقی ادارہ بن گیا۔ مسلمانوں نے یونانی علوم سے استفادہ کیا اور اپنی ضروریات کے مطابق انہیں وسعت دی اور ان میں اضافہ کیا بالخصوص یونان کی نظری اور استخراجی سائنس کو قرآن کی استقرائی تعلیم کے مطابق عملی اور استقرائی رنگ دیا اور دنیا کو سائنسی تحقیق کا طریقہ بتایا جسے اپنا کر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا یورپ علمی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔ "سائنس، عربی ثقافت کی ممنون احسان ہے کیونکہ دراصل سائنس کو اسی ثقافت نے جنم دیا ہے"(۳۸)۔ اگر عرب نہ ہوتے تو زمانۂ حاضر کی یورپی تہذیب پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی"(۳۹)۔ عباسی عہد میں توحید کے تصور نے خدا پرستانہ عقلیت کا روپ دھارا، المامون کا قول تھا کہ "جن لوگوں نے اپنی عقلی قوتوں میں اضافہ کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور اس کے بہترین اور مفید ترین بندے ہیں"(۴۰)۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی عہد میں اسلامی علوم و فنون نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی اور نہ اب تک ہے کہ کسی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں حکمران طبقے اتنے بڑے پیمانے پر حصول علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہوگئے ہوں۔ خلفاء اور اُمراء اپنے محلوں سے اُٹھ کر کتب خانوں اور رصد گاہوں میں جا گھستے تھے۔ وہ اپنے امور سلطنت سے عام طور پر غفلت برتتے تھے اور نظم و نسق خاطر خواہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اہل علم کے خطبات کو سننے اور ان سے مسائل ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ مسوّدات اور مخطوطات اور

نباتیاتی نمونوں سے لدے ہوئے کارواں بخارا سے دجلہ تک اور مصر سے اندلس تک رواں دواں رہتے تھے۔ صرف کتابوں اور معلموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندوستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے کسی سلطنت سے تاوان جنگ وصول کرنے کے سلسلے میں یونانی مصنفین یا کسی ممتاز ریاضی دان کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔ وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام، مدارس کے لئے اوقاف کے انتظام اور غریب طلبا کے لئے وظائف کے اہتمام میں اپنے آقاؤں سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتے تھے۔ اہل علم کو بلا امتیاز نسل و مذہب دوسرے سب لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ان پر دولت، ثروت اور اعزازات کی بارش کر دی جاتی۔ وہ ولایات کے حاکم تک مقرر کر دیئے جاتے۔ جب خلفاء کسی سفر یا مہم پر روانہ ہوتے تو اہل علم کا ایک گروہ اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار ہمراہ ہوتی[۴۱]۔

"خدا پرستانہ عقلیت" نے جب ایک تحریک کی صورت اختیار کی تو طریق تدریس اور نصاب تعلیم دونوں میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ منقولات کے ساتھ ساتھ معقولات نے بھی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں جگہ پائی۔ طریق تدریس نصاب میں شامل مواد کی تنظیم کا نام ہے۔ اس لئے وہ مواد سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ پس مواد کی رعایت سے استخراج اور استقرار، لکچر اور عملی تجربہ دونوں طریق تدریس قرار پائے۔ ابو یحییٰ زکریا نے اس دور کے نصاب کی حسب ذیل تفصیل دی ہے۔

۱۔ شرعیات : فقہ، علم الکلام اور علم الحدیث۔

۲۔ ادبیات : لسانیات، علم القواعد، نثر، انشاپردازی اور تاریخ۔

۳۔ ریاضیات : ہندسہ، جبر و مقابلہ، حساب، ہیئت، موسیقی، سیاسیات، معاشیات اور اخلاقیات۔

۴۔ عقلیات : منطق، جدلیات، مابعد الطبیعیات، جنرل سائنس، علم الادویہ اور کیمیا۔

ابو یحییٰ زکریا نے علوم کی درجہ بندی مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے کی ہے الخوارزمی نے بھی اس

دور کے نصاب کی تفصیل اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں دی ہے۔ لیکن اس نے درجہ بندی کا ایک مختلف اصول اختیار کیا ہے۔ جملہ علوم کو اس نے پہلے دلیسی اور بدلیسی علوم میں تقسیم کیا ہے اور پھر ان عنوانات کے تحت نصابی علوم کی فہرست دی ہے جو حسب ذیل ہے۔

۱- دلیسی علوم : فقہ، کلام، نحو، کتابت، شاعری، عروض اور اخبار (تاریخ)۔

۲- بدلیسی علوم : (ا) نظری علوم : طبعیات ریاضی، کیمیا، منطق، فلسفہ، نجوم، موسیقی اور علم الخیال ۔ (ب) عملی علوم : اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات اس تقسیم سے غالباً اس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ کون سے علوم خود اسلامی ثقافت کے زیر اثر پیدا ہوئے اور کون سے علوم باہر سے آکر اسلامی ثقافت کا جزو بن گئے۔ تاریخی اعتبار سے یہ نقطۂ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن انسانیات اور عمرانیات کے نقطۂ نگاہ سے جب کوئی خارجی عنصر کسی ثقافت میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس ثقافت میں ضم ہو جاتا ہے۔ جو حیثیت اسے اپنی مادری ثقافت میں حاصل ہوتی ہے۔ وہ قائم نہیں رہتی۔ مثلاً فلسفہ اسلامی نصاب میں علم کلام کی صورت میں داخل ہوا۔ یونانی سائنس خالصتاً نظری اور استخراجی تھی۔ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے تحت اسے عملی اور استقرائی رنگ دیا۔ اس لئے دلیسی اور بدلیسی علوم کے تحت نصابی مواد کی درجہ بندی ثقافتی ارتقار کے قوانین سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

تعلیم کو عام کرنے کے لئے عباسی دور میں ہر مسجد میں ایک مدرسہ کھولنے کا زبردست اہتمام کیا گیا۔ لیکن یہ مدارس نجی مدارس تھے۔ ان کے نظم ونسق اور اساتذہ کی تقرری میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ۴۴۷ھ میں جب سلجوقیوں نے بغداد فتح کیا تو تعلیم ریاست کی ایک اہم ذمہ داری بن گئی۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ (سلجوقی حکمرانوں) کے وزیر نظام الملک نے ۱۰۶۶ء میں سب سے پہلا سرکاری مدرسہ بغداد میں قائم کیا جو اس کے نام پر نظامیہ بغداد کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد میں اس نے عراق، خراسان، بلخ، مرو، بصرہ اور موصل میں اسی طرز کے مدارس کھولے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ملک کے طول وعرض میں سرکاری مدارس کا ایک جال پھیل گیا۔ یہ مدارس دین و سیاست کی تربیت گاہیں تھیں۔ ان کا مقصد سنی عقائد کی اشاعت اور ایرانی اور ترکی سیاست کو فروغ دینا تھا۔ ان

پر ایرانی ثقافت اور اصول نظم ونسق کی گہری چھاپ تھی۔ صنعتی، زرعی اور پیشہ ورانہ علوم وفنون کو ان میں امتیازی مقام حاصل تھا۔(۴۲) اعلیٰ تعلیم کا نصاب تقریباً وہی تھا جو عباسی دور میں رائج تھا لیکن ان مدارس میں صرف شافعیؒ فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

عثمانی ترکوں نے بھی نظامیہ مدارس کی سرپرستی کی۔ سنی عقائد اور ترکی سیاست کو ان کے ذریعے فروغ دیا۔ عربی حروف الہجا کو اپنایا اور عربی زبان کو بلاد ترکیہ میں رواج دیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے بالخصوص مدارس کے قیام کی مہم تیز تر کر دی اور شیعیت کے اثرات کو کم کرنے کے لئے قاہرہ میں "دارالعلم" بند کر دیا۔(۴۳) نورالدین زنگی نے دمشق سے مدارس کھولنے کی ابتدا کی اور سلطنت کے طول وعرض میں مدارس کا ایک جال بچھا دیا۔ خلیفہ مستنصر باللہ نے ۱۲۳۳ء میں نظامیہ بغداد کے مقابلے میں مستنصریہ کی بنیاد رکھی جس میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں فقہ کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ فاطمی دور میں مصر میں مشہور آفاق جامعہ ازہر قائم ہوئی۔ عبدالرحمٰن ثالث نے قرطبہ میں سب سے بڑی جامعہ جامع مسجد اعظم کے نام سے قائم کی جس میں فلسفہ، منطق، ریاضی، طب، طبعیات، فلکیات، حدیث، فقہ، تفسیر اور کلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ الناصر الدین اللہ نے مدینۃ الزہرا تعمیر کرایا جو جلد ہی فلسفہ، سائنس، طب اور صنعت وحرفت کا مرکز بن گیا۔

## اسلامی تعلیمی ادارے

دنیائے اسلام میں دو قسم کے ادارے تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز تھے، ایک رسمی ادارے اور دوسرے غیر رسمی ادارے۔ سفری معلم، حلقے کتاب، شاہی مدارس، صحرائی مدارس، مسجد سے ملحق مدارس، نظامیہ مدارس اور جامعات پر مشتمل تھے۔ غیر رسمی اداروں میں کتاب گھر، علماء کی رہائش گاہیں اور خلفاء کے دانش کدے شامل تھے۔ قرون وسطیٰ میں یہ ادارے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اساس تھے۔ انہی کے ذریعے اسلامی ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوئی جس کے گہرے اثرات دوسری اقوام پر بھی پڑے۔ پہلے ہم تعلیم کے رسمی اداروں سے بحث کریں گے۔

## ۱۔ سفری معلم:

عالم اسلام کا سب سے پہلا تعلیمی ادارہ سفری معلم تھے۔ جو قبائل دعوت اسلام قبول کر لیتے نبی اکرمؐ حسب ضرورت کسی صحابی یا اصحابہ کی ایک جماعت کو انہیں دینی احکام کی تعلیم دینے کے لئے بھیج دیتے۔ اپنا کام مکمل کر کے وہ کسی اور جگہ تبلیغ کے لئے چلے جاتے۔ اس طرح وہ زیادہ تر سفر میں رہتے۔ ہجرت سے قبل بھی رسول اکرمؐ نے مصعب بن عمیر اور حضرت ام کلثوم کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ عام طور پر قرأ سفری معلم کا فرض انجام دیتے تھے۔ علم تقوے اور نیکی کا سرچشمہ ہے۔ اس اصول کے تحت قرار کا کام لوگوں کو قرآن کی سورتیں اور شرعی احکام زبانی یاد کرانا تھا تاکہ وہ ان کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منظم کر سکیں۔

## ۲۔ حلقہ

سفری معلم اتنی ہی تعلیم دیتے تھے جتنی کہ دین پر عمل کرنے کے لئے ضروری تھی۔ لیکن اس سے دینی امور میں گہری نظر نہیں پیدا ہوتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے شخصی درس کے حلقے قائم ہوئے جسے مہدی نختیں نے "دنیائے اسلام کا منفرد تعلیمی تجربہ" قرار دیا ہے۔ حلقہ ایک شخص کے وجود کا نام تھا۔ وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا اس کے گرد شاگردوں کی ایک کثیر جماعت جمع ہو جاتی تھی۔ وہ کسی چوکی، چبوترے یا منبر پر بیٹھتا تھا جو عام طور پر کسی دیوار یا ستون سے ملحق ہوتا تھا۔ طلبار نصف دائرے میں اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ حلقہ شاگردوں کی انفرادی تعلیمی استعداد کے مطابق بنایا جاتا تھا۔ ذہین ترین طلبار کو استاد کے قریب جگہ ملتی تھی جو نصف دائرے کے ایک سرے پر ہوتے تھے جب کہ دوسرے سرے پر حلقے کے کمزور طلبا بیٹھتے تھے۔ اس طرح استاد حلقے کے قابل اور کمزور طلبا پر نگاہ رکھتا تھا۔[۴۴] مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے حلقے میں ایک خاص جگہ ہوتی تھی جنہیں حسب دستور سوال کرنے کا بھی حق ہوتا تھا۔

درس میں املا کا طریقہ استعمال ہوتا تھا جسے آج کل ہم لکچر کہتے ہیں۔ "استاد کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا اور طالب علم جو ہمیشہ قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے لکچر کو استاد کے الفاظ میں لکھتے جاتے تھے۔ اس

طرح ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔۔۔۔ جب معمول سے زیادہ طلبار حلقہ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاد کے دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے۔ یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے۔"(۴۵) عثمانی عہد میں املا کا طریقہ رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ آٹھویں صدی (ہجری) میں حافظ زین الدین عراقی نے اس کو زندہ کرنا چاہا اور تقریباً چار سو مجلسوں میں اس طرح درس بھی دیا۔ حافظ ابن حجر و سخاوی نے بھی ان کی تقلید کی مگر اس طریقہ کا انہی بزرگوں پر خاتمہ ہو گیا۔ جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا مگر لوگوں کی بے توجہی دیکھ کر خود باز رہے"(۴۶)۔ اس طرح املا کی جگہ کتاب کے درس نے لے لی۔

مسجد چونکہ دینی تعلیم کا مرکز تھی اس لئے یہیں پہلے پہل حلقے وجود میں آئے۔ درس میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے استاد نے سبق کا آغاز پچھلے سبق کے جائزے سے کرتا تھا اور مشکل مقامات پر نسبتاً زیادہ وقت دیتا تھا یا درس املا کے دوران طلبار کو سوال کرنے کی عام اجازت تھی۔ حلقے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دور دراز کا سفر کر کے طلبار درس میں شریک ہوتے تھے۔

## ۳۔ کتّاب

اسلام سے قبل بھی عرب میں درسگاہیں تھیں جنہیں کتّاب کہتے تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے بالخصوص کتابت یعنی فن تحریر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ظہور اسلام کے وقت قبیلہ قریش میں صرف سترہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ یہ کتّاب اساتذہ اپنے گھروں پر قائم کرتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد ان مراکز میں ابتدائی دینی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ "کتاب کے ابتدائی اسکول کا نصاب قرآن پڑھنے پر مرکوز تھا۔ پڑھنے کے علاوہ لکھنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پڑھائی لکھائی کے ساتھ ساتھ طلبار کو عربی قواعد، رسول اکرمؐ کی زندگی کے حالات بالخصوص حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی"(۴۷)۔ ابن جبیر، ابن بطوطہ اور ابن خلدون کی روایت کے مطابق ایک ہی استاد کتابت اور قرآن نہیں پڑھاتا تھا۔ دونوں کے لئے الگ الگ استاد ہوتے تھے۔ بعض کتّاب میں صرف پڑھنے لکھنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور بعض میں قرآن اور کتابت دونوں کی۔ حتّی اور گولڈزیہر نے اس بات کو نظرانداز

کردیا ہے۔(۴۷) کتاب قریہ قریہ قائم تھے۔ اندلس، اطالیہ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں ان کا بہت زور تھا کتاب یا مکتب کے اساتذہ "معلمین" کہلاتے تھے۔

## ۴۔ مساجد سے ملحق مدارس۔

مسجد اسلام کا روایتی تعلیمی ادارہ ہے جس کی ابتداء مسجد نبوی سے ملحق اصحاب صفہ کی درسگاہ سے ہوئی جو باہر سے آنیوالے طلباء کے لئے دارالاقامتہ کا کام دیتی تھی اور مدرسے کا بھی۔ پہلی صدی ہجری میں جہاں جہاں بھی اسلام کے قدم جمے مسجد تعلیم کا مرکز بنی رہی۔ حضرت عمرؓ نے مسجدوں کی تعمیر اور ان میں مدارس قائم کرنے پر زور دیا۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ہر مسجد میں مدرسہ قائم کرنے کی زبردست مہم چلائی جس سے تعلیم عام ہوگئی۔ قرطبہ، دمشق، قاہرہ اور بغداد کی مساجد اپنے دور کی عظیم درسگاہیں تھیں۔ ابتدائی دینی تعلیم سے لے کر تفسیر، فقہ، حدیث، لغت، ادب، شاعری، ریاضی، ہیئت، منطق کلام طب وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم مساجد ہی میں دی جاتی تھی۔

## ۵۔ نظامیہ مدارس۔

سلجوقی دور میں اسلام کے مروجہ نظام تعلیم میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ مدرسہ مسجد سے الگ ہو کر ایک علیحدہ عمارت میں منتقل ہوا اور تعلیم ریاست کی ایک اہم ذمہ داری بن گئی۔ الپ ارسلان اور محمد شاہ کے وزیر نظام الملک نے اس نوع کا پہلا مدرسہ بغداد میں قائم کیا جو اس کے نام پر مدرسہ نظامیہ کہلایا۔ بعد میں اس نے عراق، خراسان، بلخ، مرو، بصرہ اور موصل میں بھی اسی نوع کے مدارس کھولے۔ ان مدارس میں دینی اور لسانی علوم کے علاوہ سائنس اور فلسفے کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ نظامیہ بغداد میں ایک شعبہ اجنبی زبانوں کا بھی تھا جہاں یونانی، عبرانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ تیراندازی، شمشیر زنی اور گھڑسواری کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔(۴۹) ۱۱۹۶ء میں جب سعدی نظامیہ میں داخل ہوئے تو اس وقت وہاں سات ہزار طلباء زیر تعلیم تھے۔

مدرسوں کا تقرر حکمران وقت کرتا تھا۔ ہر مدرس کے تحت دو نائب مدرس ہوتے تھے جو درس ختم ہونے کے بعد طلباء کو دوبارہ لکچر پڑھ کر سناتے تھے اور اس کی تشریح بھی کرتے تھے۔ مدرس کھڑے ہو کر درس دیتے تھے۔ طلباء

اسٹول پر بیٹھتے تھے۔ انہیں سوال کرنے کی عام اجازت تھی۔ ان مدارس میں درس کے لئے ایک علیحدہ ایوان ہوتا تھا جسے آج کل لکچر کا کمرہ کہتے ہیں۔ طلبار کے لئے وظائف مقرر تھے۔ امام غزالی (م۔ ۱۱۱۱) نے نظامیہ بغداد میں تعلیم پائی اور بعد میں اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ کاغذ کی قلت کی وجہ سے تعلیم زیادہ تر یادداشت پر مبنی تھی۔ غزالی کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں تین لاکھ احادیث حفظ تھیں۔ اسی طرح امام بن حنبل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں دس لاکھ احادیث زبانی یاد تھیں۔

## ۶۔ جامعات

نظامیہ بغداد کے قیام کے محرکات خالصتاً مذہبی تھے لیکن اس میں صرف شافعی فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جس سے دین کی جامع تعلیم کا مقصد نہیں پورا ہوتا تھا۔ خلیفہ مستنصر باللہ نے اس کمی کو محسوس کیا اور نظامیہ بغداد کے مقابلے میں وسیع المشرب مستنصریہ کی بنیاد رکھی جس میں چاروں فقہوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فقہ کے علاوہ اس میں حدیث، نحو، طب، فرائض اور الہئیات کے علیحدہ علیحدہ شعبے تھے۔ ہر شعبے کا ایک الگ سربراہ تھا جسے شیخ کہتے تھے۔ دستار اور جبہ مدرس کا خصوصی لباس تھا۔ وہ ایک اونچی چوکی پر بیٹھ کر درس دیتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں ایک ایک معاون کھڑا ہوتا تھا جو بعد میں استاد کا لکچر طلبار کو پڑھ کر سناتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اس کی تشریح بھی کرتا تھا۔ طلبار کو جامعہ کی طرف سے چٹائیاں، قلم، دوات، کاغذ

اور چراغ کے لئے زیتون کا تیل مفت ملتا تھا۔ رہائش اور خورش کے علاوہ ہر طالب علم کو ایک ایک اشرفی ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ جامعہ کے صدر دروازے پر ایک گھڑی آویزاں تھی۔ اس میں ایک حمام بھی تھا۔

مستنصریہ دنیائے اسلام میں واحد جامعہ نہ تھی۔ اس سے پہلے فاطمی دور میں جامعہ ازہر مصر قائم ہوئی۔ اور اس سے بھی پہلے عبدالرحمٰن سوم نے جامعہ قرطبہ کی بنیاد رکھی جو یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی جامعہ قرطبہ دینی اور لسانی علوم کے علاوہ سائنس اور فلسفے کی تعلیم کے لئے مشہور تھی ابن حزم، ابن طفیل اور ابن رشد وغیرہ نامور مفکرین نے یہیں تعلیم پائی۔ مسلمان طلبار کے علاوہ فرانس، اطالیہ، جرمنی اور انگلستان کے طلبا بھی یہاں پڑھنے آتے تھے۔ سلوستر، بابائے روم نے بھی اس جامعہ میں تعلیم پائی۔ قرطبہ کا ایک پادری

الوا رو لکھتا ہے "جتنے نوجوان مسیحی علم و استعداد کے اعتبار سے ممتاز ہیں وہ سب عربوں کی زبان اور ادب سے باخبر ہیں۔ عربوں کی کتابیں ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ زر کثیر صرف کر کے عربوں کے عظیم کتب خانوں میں جمع ہوتے ہیں اور ہر جگہ نہایت بلند آہنگی سے عربی ادب کی تحسین و تعریف کرتے ہیں"(۵۰)۔ جامعہ قرطبہ کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ جب مسلمانوں کو اسپین سے نکال دیا گیا اور ان کی کتابیں جلادی گئیں تو اسپین کے بادشاہ فلپ دوم کو لائبریری بنانے کا خیال آیا۔ پوری تلاش کے بعد اسے صرف اٹھارہ سو کتابیں ملیں جن میں اسلامی کتب صرف نو سو تھیں۔ اس لائبریری کا نام اسکوریال لائبریری ہے جو میڈرڈ میں قائم ہوئی تھی(۵۱)۔

## ۷۔ صحرائی مدارس

فتوحات کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں کا دوسری اقوام سے اختلاط بڑھا تو عربی زبان دوسری زبانوں بالخصوص ارامی سے متاثر ہوئی۔ شہروں میں یہ اثر زیادہ نمایاں تھا۔ صرف بادیہ یعنی صحرائے شام جہاں بدیسی لوگوں کا گذر نہ تھا صحیح عربی سیکھنے کی واحد جگہ رہ گئی۔ بادیہ کے بدوؤں نے شہروں کا رخ کیا اور پڑھانے بیٹھ گئے۔ شہر کے لوگوں کی اکثریت اس انتظام سے مطمئن تھی لیکن امراء، رؤسا اور شہزادے خود بادیہ جاتے تھے جو اس زمانے میں اسکول کا کام دیتا تھا۔ اموی خلفاء کو عربیت کے تحفظ کا بڑا اہتمام تھا۔ فلپ حتی لکھتا ہے "بادیہ یعنی صحرائے شام ابتدائی اموی شہزادوں کے لئے ایک طرح کی درسگاہ کا کام دیتا تھا جہاں اموی فرمانروا اپنے نوجوان لڑکوں کو بھیج دیتے تھے کہ خالص عربی زبان (جو ارامی کے اثرات سے بالکل پاک ہو) اور شعر میں مہارت پیدا کریں۔ امیر معاویہ نے اپنے لڑکے اور آئندہ جانشین یزید کو یہیں بھیجا تھا(۵۲)۔ آخری اموی خلفاء نے صحرائے شام کے کنارے دیہاتی محلات بنوائے جو البادیات کہلاتے تھے۔

## ۸۔ شاہی مدارس

صحرائی مدارس خواص کی درسگاہیں تھیں جو اموی دور میں اپنے عروج پر تھیں۔ ان کا مقصد صرف خالص عربی زبان سکھانا تھا۔ نوعمر شہزادوں کی عمومی تعلیم کے لئے شاہی محلوں میں مدارس قائم تھے جہاں انہیں مخصوص ثقافتی اقدار اور شاہی آداب سکھائے جاتے تھے۔ نصاب کا انتخاب امراء اور خلفاء خود کرتے تھے۔ عمومی

نصاب کے علاوہ انہیں فن خطابت، آداب گفتگو، ضابطۂ اخلاق، حدیث اور قومی تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔ ان مدارس کے اساتذہ مودِّب کہلاتے تھے۔ وہ اکثر محل میں رہتے تھے اور اپنے شاگردوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بنی فاطمی نے محل میں ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جس میں اچھے گھرانوں کے بچوں کو سرکاری ملازمت کی تربیت دی جاتی تھی۔(۵۲)

یہ تو تھے دنیائے اسلام کے رسمی تعلیم کے ادارے جن میں سے پہلے چھ اداروں کا تعلق عوام کی تعلیم سے تھا اور آخری دو کا منتخب خواص کی تعلیم سے اب ہم غیر رسمی تعلیمی اداروں سے بحث کریں گے۔

## ۱۔ کتاب گھر

"عباسی خلفا حصول علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار تھے"۔ وزرار اور امرار بھی انہی کی طرح علم کے شیدائی تھے۔ ان کے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے عالم اسلام میں کتاب گھروں کو بڑا فروغ ہوا اور نقل نویسوں کی مانگ بڑھ گئی۔ کتاب گھر غیر رسمی تعلیم کا مرکز بن گئے۔ بغداد، قاہرہ، مشہد اور قرطبہ میں یہ بہت مقبول تھے یہاں روزانہ علمی مجلسیں ہوتی تھیں۔ علمار، شعرار، طلبار اور شائقین فارغ وقت کا بیشتر حصہ کتاب گھروں میں گذارتے۔ نئی کتابوں اور نایاب مسوّدوں پر تبادلۂ خیال کرتے۔ غزالی، ابن رشد اور دوسرے مفکرین وقت کے خیالات سے مستفید ہوتے۔ تاجران کتب نایاب مسودوں کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرتے اور خلفار، وزرار اور امرار سے منہ مانگی قیمت وصول کرتے۔

## ۲۔ علمار کی رہائش گاہیں

غیر رسمی تعلیم کا دوسرا مرکز علمار کی رہائش گاہیں تھیں جہاں وہ چیدہ چیدہ کتابوں کا درس دیتے اور اپنی ذاتی کتب خانے کے نایاب مسودوں سے طلبار اور شائقین کو مستفید کرتے۔ ابن سینا اپنے گھر پر الشفا اور القانون کا درس دیتا تھا۔ ابو سلیمان السجستانی کا گھر علمار اور ادبار کی نشست گاہ تھی جہاں ادب، نحو، لسانیات، فلسفے اور منطق پر گرما گرم بحثیں ہوئی تھیں۔ توحیدی نے مقابسات میں ان بحثوں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ نظامیہ بغداد سے فارغ ہونے کے بعد غزالی اپنے گھر پر دین اور اخلاق کی تعلیم دیتے تھے۔(۵۴)

## ۳۔ دانش کدے

کتاب گھروں اور علمار کی رہائش گاہوں کے بعد خلفار کے دانش کدے غیر رسمی تعلیم کا تیسرا مرکز تھے

ان کی ابتدا خلفائے راشدین کی نجی مجالس سے ہوئی جن میں وہ دین سے متعلق لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے تھے۔ ہر شخص اپنی مرضی سے مجلس میں شامل ہوتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ خلیفہ کو اس کے نام یا امیرالمومنین کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ اہل مجلس چٹائی یا قالین پر بیٹھتے تھے۔

اموی اور عباسی دور میں محلوں کے ساتھ ساتھ دانش کدے وجود میں آئے۔ معاویہ اپنے دربار میں عرب کی تاریخ اور مشہور جنگوں پر علماء سے بحث کیا کرتے تھے۔ عبدالملک ان مباحث کی خود نگرانی کرتا تھا عباسی دور میں دانش کدے عروج پر پہنچ گئے۔ شبلی کی تحقیق کے مطابق ان پر دوسری تہذیبوں اور غیر ملکی رسوم کا گہرا اثر تھا۔ مذاکرات کی تیاری پر زرکثیر خرچ کیا جاتا تھا اور صرف مخصوص طبقے کے لوگوں کو ان میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ مقررہ وقت پر آنا اور مخصوص لباس پہننا ان کے لئے لازمی تھا۔ شرکاء کی نشستیں پہلے سے مقرر ہوتی تھیں جو ان کے علوئے مرتبت کو ظاہر کرتیں۔ بحث کا آغاز خود خلیفہ کرتا تھا شرکاء کے لئے ضروری تھا کہ وہ آداب مجلس کا خیال رکھیں۔ شستگی اور شائستگی سے گفتگو کریں۔ قطع کلامی کی بالکل اجازت نہ تھی۔[55] ہارون رشید کے زمانے میں ان دانش کدوں کو بے انتہا فروغ ہوا۔ اس کے دربار میں ادب، قواعد، شاعری، مذہب، فلسفے اور کلام پر عام بحثیں ہوتی تھیں۔ المامون نے ان مذاکرات میں تنوع پیدا کیا۔ مذہبی اور فلسفیانہ مسائل پر وہ مختلف الخیال علماء کو دعوت مذاکرہ دیتا جیسے المانوی مفکر ہیگل کی طرح اس کا خیال ہو کہ حقیقت ہمیشہ اضداد کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان مذاکرات نے اعلیٰ تعلیم کو بہت فروغ دیا اور خلفاء کے دربار اسلامی ثقافت کا مرکز بن گئے۔ ایسا ہی ایک مذاکرہ نظام الملک کے دربار میں ہوا جس میں غزالی جیت گئے اور نظامیۂ بغداد کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔

اس مختصر جائزے سے ایک بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلام کے نظام تعلیم کی بنیاد "کتاب" کے علم اور حکمت کے اصول پر ہے جن کا لب لباب توحید کا تصور ہے۔ یہ تصور حرکت اور قوت کا سرچشمہ ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سرتاپا اس تصور کی تفسیر بن جائے۔ خیال یا تصور معاشرے کی اصلاح اور اس کی از سر نو تنظیم کی اساس ہے۔ لیکن اصلاح اور تنظیم نو کا کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود اس تصور کے جملہ مضمرات کا ہمیں واضح اور مکمل طور پر علم نہ ہو۔ پس

عقل و فکر کی مدد سے توحید کے تصور کی گہرائی اور پہنائی کا حتی الامکان ادراک کرنا اور اس کے انفرادی، اجتماعی معاشی اور سیاسی مضمرات کو اچھی طرح سمجھنا اس پر عمل کرنے کی لازمی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے قرآن کی سورتیں حفظ کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ قرأت اور تجوید کو کافی نہیں سمجھا۔ شرعی احکام کی حکمت ظاہر کرنے کے لئے آپ نے حسب ضرورت قرآنی آیات کی تفسیر بھی کی۔ حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہو وہ قرآن نہ پڑھائے۔ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس بات پر زور دیا کہ کلام اللہ میں جب کسی لفظ کے معنی سمجھ میں نہ آئیں تو اسے اشعار عرب میں تلاش کیا جائے۔ قرآن پڑھنے میں غلطی سے بچنے اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے حضرت علی نے ابوالاسود دوئلی سے نحو کے ابتدائی قاعدے مرتب کرائے۔ حضرت عمرؓ نے حدیث کی تدوین کی۔ فقہ کے نئے علم کی بنیاد رکھی اور معاملات کے باب میں اجتہاد کا دروازہ کھولا اس طرح فزائیدہ معاشرے کی روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قرأت اور تجوید کے علاوہ رفتہ رفتہ تفسیر، حدیث، فقہ، شاعری، ادب، لغت اور نحو کے علوم اسلام کے توحید پرست نصاب تعلیم میں داخل ہوئے۔ اموی دور میں ان علوم کا دائرہ وسیع ہوا اور عروض، معانی، انشاء، خطاطی اور تاریخ کے نئے علوم نصاب میں داخل ہوئے۔ عباسی عہد میں "حکمت" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ توحید کے تصور نے "خدا پرستانہ عقلیت" کا روپ دھارا اور منقولات کے ساتھ ساتھ معقولات نے نصاب میں مساوی جگہ پائی۔ دینی اور لسانی علوم کے علاوہ منطق، فلسفہ، کلام، معاشیات، سیاسیات، اخلاقیات ریاضی، طبیعات، کیمیا، حیاتیات وغیرہ کے علوم اعلیٰ تعلیم کے نصاب کا لازمی جز و بنے۔

---

# حوالہ جات

۱- قرآن- ۴۱ : ۵۳ ، ۵۱ : ۲۱ -

۲- قرآن - ۶۲ : ۲ -

۳- قرآن - ۱۷ : ۹۵ -

۴- قرآن - ۱۰ : ۴۳ -

۵- قرآن - ۱۴ : ۴ -

۶- قرآن - ۱۶ : ۱۲۵ -

۷- قرآن - ۲ : ۲۶۹ -

۸- قرآن - ۲۰ : ۴۴ -

۹- قرآن - ۲۱ : ۷ -

۱۰- قرآن - ۱۳ : ۳ -

۱۱- قرآن - ۲۸ : ۷۷ -

۱۲- قرآن - ۲ : ۲۴۷

۱۳- قرآن - ۵۷ : ۲۵ -

۱۴- قرآن - ۳۴ : ۱۰ -

۱۵- قرآن - ۲۵ : ۳۲ -

۱۶- قرآن - ۱۷ : ۱۰۶ -

۱۷- قرآن - ۲ : ۲۱۹ -

۱۸- قرآن ۴ : ۴۳ -

۱۹- قرآن - ۵ : ۹۰ -

۲۰ - قرآن - ۱۲ : ۷۶ -

۲۱ - قرآن - ۱۸ : ۶۰ -

۲۲ - امریکی ماہر تعلیم جان ڈیوی (۱۸۵۹ - ۱۹۵۲) کے نزدیک تعلیم کا تعلیمی عمل سے باہر کوئی مقصد نہیں ہے۔ تعلیم آپ اپنا مقصد ہے اور وہ ہے "مزید تعلیم، مسلسل تعلیم"۔ اس کی غرض افراد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی تعلیم ساری عمر جاری رکھ سکیں۔ ان کی نمو کی صلاحیت روز افزوں ترقی کرے۔ (ڈیموکریسی اینڈ ایجوکیشن، میکملن اینڈ کمپنی، نیو یارک، ۱۹۱۶ء، ص ۱۱۷)۔ ڈیوی نے اسلام کی طرح مزید تعلیم اور "مسلسل تعلیم" پر زور ضرور دیا ہے لیکن دونوں کے نقطۂ نظر میں بنیادی اختلاف ہے۔ اسلام کی رو سے تعلیم کا مقصد توحید کے تصور کو دلنشین کرنا ہے اور یہ ایک عمر بھر کا مشغلہ ہے جو "مزید تعلیم" اور "مسلسل" تعلیم کا متقاضی ہے۔ ہر ذی علم کے اوپر چونکہ ایک ذی علم ہے اس لیے تحصیل علم کا سلسلہ زندگی کے اختتام کے ساتھ ہی ختم ہو سکتا ہے۔ ڈیوی لادینی نتائجیت (PRAGNATISM) کا حامی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت اولیٰ کوئی ابدی اصول نہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی سے پیدا ہونے والا معاشرتی تغیر ہے جس سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دینا تعلیم کا اصل کام ہے نصاب کی بنیادی اکائی تصور نہیں تجربہ ہے اور صرف تجربہ۔ "تعلیم تجربے کی تعمیر نو یا تنظیم نو ہے جو تجربے کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے اور بعد کے تجربات کا رخ متعین کرنے کی لیاقت بڑھاتی ہے" (ڈیموکریسی اینڈ ایجوکیشن۔ ص ۸۹ - ۹۰) معاشرتی تغیر چونکہ ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے، اس لئے تعلیم عمر بھر کا مشغلہ ہے۔

۲۳ - معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، حصہ دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء، ص ۲۲۹ -

۲۴ - ایضاً - ص ۳۴۲ -

۲۵ - ایضاً - ص ۳۴۱ -

۲۶ - ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام تعلیم، حیدرآباد دکن، ۱۳۶۱ھ ص ۱۰ -

۲۷ - ایضاً - ص ۱۰ -

۲۸ - ایضاً ۔ ص ۱۷ ۔

۲۹۔ ایضاً ۔ ص ۱۸ ۔

۳۰ - معین الدین احمد ندوی ، ص ۳۴۸ ۔

۳۱ - ایضاً ۔ ص ۳۴۶ ۔

۳۲ - ایضاً ۔ ص ۳۴۳ ۔

۳۳ - مفتی انتظام اللہ شہابی ، اسلام نظام تعلیم کا چودہ سو سالہ مرقع ، کراچی ، ۱۹۶۱، ص ۴ ۔

۳۴ - معین الدین احمد ندوی ، ص ۳۵۶ ۔

۳۵ - ایضاً ۔ ص ۳۵۹ ۔

۳۶ - مہدی نخستین ، ہسٹری آف اسلامک اوریجنز آف ویسٹرن ایجوکیشن ، کلارو ڈ ، ۱۹۶۴ء ، ص ۴۴ ۔

۳۷ - ای ۔ ایچ ۔ وائلڈز ، دی فاؤنڈیشنز آف ماڈرن ایجوکیشن ، رائن ہارٹ اینڈ کمپنی ، ۱۹۵۹ء ، ص ۲۱۶ ۔

۳۸ - رابرٹ بریفالٹ تشکیل انسانیت۔ مترجم عبدالمجید سالک لاہور ۱۹۵۸ء ص ۲۴۷ ۔

۳۹ - ایضاً ، ص ۲۴۹ ۔

۴۰ - بحوالہ بریفالٹ ، ص ۲۴۱ ۔

۴۱ -

۴۲ - ڈاکٹر عبدالقیوم ، قرون وسطیٰ کا نظام تعلیم ، لاہور ، ۱۹۷۱، ص ۱۸ ۔

۴۳ - ایضاً ، ص ۱۹ ۔

۴۴ - ایضاً ، ص ۳۰ ۔

۴۵ - مقالات شبلی ، جلد سوم ، اعظم گڑھ ، ۱۹۵۵، ص ۸۱ ۔

۴۶ - ایضاً ۔ ص ۸۴ - ۸۵ ۔

۴۷ ۔ فلپ حتی، دی ہسٹری آف عربز، نیویارک، ۱۹۵۱، ص ۴۰۸ ۔

۴۸ ۔ احمد شیلبی، ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن، لبنان، ۱۹۵۴، ص ۲۱ ۔

۴۹ ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسان، لاہور، ۱۹۶۵، ص ۱۴۲ ۔

۵۰ ۔ رابرٹ بریفالٹ، تشکیل انسانیت، ص ۲۵۷ ۔

۵۱ ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ص ۱۴۳ ۔

۵۲ ۔ فلپ حتی، تاریخ ملت عربیا، مترجم مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۴۰

۵۳ ۔ احمد شیلبی، ص ۲۶ ۔

۵۴ ۔ ایضاً، ص ۲۱ ۔

۵۵ ۔ ایضاً، ص ۲۶ ۔